OPEN ACCESS
AL-EHSAN
ISSN(E) 2788-4058
ISSN(P) 2410-1834
www.alehsan.gcuf.edu.pk
PP: 9-34

ملا علی قاری کا اسلوبِ تفسیرِ اشاری:
تفسیر انوار القران واسرار الفرقان کا اختصاصی مطالعہ

Mullah Ali Qari's Style in Tafseer-e-Ishari: A Special Study of Tafseer Anwar-ul-Quran and Asrar-ul-Furqan

Hafiz Muhammad Ahsan

Lecturere Govt. Islamia College & PhD Scholar,

Govt. College University, Faisalabad

Dr. Humayun Abbas

Professor, Govt. College University, Faisalabad

Abstract
Quran e Majeed has always been a focus point of every learned fellow because it is the real source of knowledge.Therefore the learners have produced great works of Quranic studies. A renowned Claric Mulla Ali Qari (1014 H) occupies a distinguished place regarding his own works on Quranic studies. He has done remarkable work on Quran that comprises of Tafseer Anwar ul Quran (5 volumes). Tafseer Anwar-ul-Quran by Mullah Ali Qari is one of the best representative of Ashari Tafseer. Tafseer-e-Ashari means gaining access to the hidden and precise meanings of the Quranic words which do not contradict with Shari'ah. Ali Qari, while paving the way for harmony and adaptation with the relics, has made the same interpretations that have been criticized. This article illustrates the successful attempt to reconcile them and their style.
Keywords: Tafseer-e-Ishari, Tafseer Anwar-ul-Quran, Mullah Ali Qari, Shariah, Harmony.

متحیر العقول، معجز کلام، قرآن مجید کی تفہیم کے سلسلے میں جہاں ظاہری معنی کی رعایت کرتے ہوئے مختلف رجحانات پر مبنی تفاسیر منصۂ شہود پر آئیں، وہیں پر جلیل القدر صوفیہ نے "نزل

القران على سبعة احرف لكل آية ظهر و بطن ولكل حرف حد و مطلع"[1] کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کے پوشیدہ معانی تک رسائی اور دقیق مفاہیم پر مبنی تفاسیر مرتب کیں جن کو صوفیانہ تفاسیر (اشاری تفاسیر) سے ملقب کیا گیا۔

یہ امر شک وشبہ سے بالا ہے کہ قرآن جن باطنی معانی پر مشتمل ہے، ہر عقل کو وہاں تک رسائی حاصل نہیں ہے اسی طرح جو عقول ان کے سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں وہ بھی باہم مساوی نہیں ہیں ان میں بھی فرق مراتب پایا جاتا ہے۔ صوفیہ نے اپنے روحانی ذوق اور علمی وفور وشوق سے تفسیری نکات بیان کیے۔ ذوق کے تنوع کے سبب جیسے دیگر مفسرین کی تعبیرات میں فرق محسوس ہوتا تھا وہ یہاں بھی نظر آیا۔ صوفیہ سمجھتے تھے کہ معانی قرآن کے پیچھے کچھ اسرار ورموز اور حقائق پوشیدہ ہیں ہم نے اپنے روحانی تجربات کی بنیاد پر ان کو بیان کیا بالکل اسی طرح جیسے سورہ نصر کے الفاظ سے بعض دانائے راز اصحاب رسول نے وصال نبوی کے لمحات کو قریب محسوس کر لیا۔

صوفیہ کی آڑ میں کچھ باطنیہ بھی نمودار ہوئے جن کا اخلاق و کردار شریعت اسلامیہ سے بالکل علیحدہ اور فکر و نظر کے ڈانڈے فلسفہ یونان سے ملتے تھے۔ انہوں نے قرآن کے ایسے معانی دریافت کرنے شروع کیے جو پیغام نبوی کی روح سے کوئی مطابقت نہ رکھتے تھے۔ اسی تناظر میں اہل فن نے صوفیانہ تفاسیر کو دو قسموں (نظری و اشاری) میں منقسم کیا۔ اول الذکر مردود اور موخر الذکر مقبول قرار دی گئیں بایں معنی کہ تفسیر نظری کو فلسفہ یونانی اور فرقہ باطنیہ کے عقائد سے مستعار جانا اور حلول واتحاد کے ساتھ منسوب کرتے ہوئے غیر مقبول، جب کہ چند شرائط کے ساتھ اس تفسیر کو معانی کے مختلف محمولات کی بناء پر تفسیر اشاری سے موسوم کرتے ہوئے مقبول قرار دیا گیا۔ تفسیر اشاری سے مراد ھو تأويل آيات القرآن الكريم على خلاف ما يظهر منها بمقتضى إشارات خفية تظهر لأرباب السلوك ويمكن التطبيق بينها وبين الظاهر المراده[2]

یعنی اصحاب سلوک پر ظاہر ہونے والے پوشیدہ اشارات کی بنا پر قرآن کی ایسی تفسیر بیان کرنا جو اس کے ظاہر کے خلاف ہو لیکن ظاہر وباطن میں جمع تطبیق ممکن ہو۔

تفسیر اشاری میں کن شروط کا پایا جانا ضروری ہے جس سے وہ قابل قبول ہو سکے -وہ شروط مندرجہ ذیل ہیں:

1- تفسیر اشاری قرآن کریم کی ظاہری نظم وترتیب کے منافی نہ ہو۔

2-کسی شرعی دلیل وبرہان سے اس کی تائید ہوتی ہو۔

3-اس کا کوئی شرعی یا عقلی معارض نہ ہو۔

4-چوتھی شرط یہ ہے کہ یہ دعوی نہ کیا جائے کہ صرف اشاری تفسیر ہی مراد ہے اور ظاہری معنی مراد نہیں-پہلے ظاہری معنی کا اعتراف ضروری ہے اس لیے کہ جب تک ظاہری معنی کی تعیین نہ کی جائے باطنی مفہوم تک رسائی ممکن نہیں۔ (3)

ملا علی قاری نے اپنی تفسیری مساعی (تفسیر انوار القران و اسرار الفرقان) میں ان شرائط کا بھرپور اہتمام کیا ہے۔ موضوع سخن کی طرف میلان سے قبل کچھ مصنف علیہ الرحمۃ کے بارے میں۔

ترجمۃ الملا علی قاری

آپ کا نام علی اور آپ کے والد کا نام سلطان محمد ہے۔4 بعض نے سلطان اور محمد کے درمیان ابن کا اضافہ کیا ہے اور اس سے آپ کے دادا مراد لیے ہیں جو کہ صحیح نہیں۔ اس لیے کہ ملا علی قاری کا تعلق ہرات (عجم) سے تھا، اور عجمیوں میں یہ عادت ہے کہ اپنی اولاد کا نام جڑواں (محمد حسن، فاضل محمد) رکھتے ہیں۔ (5)

آپ کی کنیت "ابو الحسن" اور لقب "نور الدین" ہے۔ عبد الحیٔ لکھنوی، ایک سطر میں تمام چیزوں کو یوں بیان کرتے ہیں۔

علی قاری کا پورا نام اَبو الحسن علی بن سلطان محمد نور الدین الملا الہروی القاری تھا، مشہور و معروف محدث وفقیہ، جامع معقول و منقول تھے۔ ہرات میں پیدا ہوئے، مکہ معظمہ میں وفات پائی۔ آپ کا سن وفات 1014ھ ہے۔ (6)

"الھروی" (بفتح الھاء والراء المھملہ)، "ھَرَاۃ" (بفتح الھاء والراء) میں پیدا ہونے کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔ یہ افغانستان کے وسط میں واقع ہے۔ اب یہ افغانستان کا دوسرا دارالحکومت ہے۔ (7)

"المکی" آپ کو اس لیے کہا جاتا ہے کہ جب پہلے صفوی سلطان اسماعیل بن حیدر نے ہرات پر تسلط قائم کیا(8) اور قتل و غارت گری اور رافضی عقائد کی اشاعت کی تو آپ ہجرت کر کے مکہ چلے گئے۔ چالیس سال تک وہیں رہے اور مکہ معظمہ میں 1014ھ میں وفات پائی۔ (9)

تفسیر ملا علی قاری کے اشاری مآخذ و مصادر

ملا علی قاری نے صوفیانہ و دقیق تفسیر کے سلسلے میں جن کتب سے استفادہ کیا وہ مندرجہ ذیل ہیں:

1۔ تفسیر تستری از امام سہل تستری (۲۸۳ھ م)

2۔ تفسیر عرائس البیان فی حقائق القرآن از امام شیخ روزبہان بقلی (۴۰۴ھ م)

3۔ تفسیر السُلمی از امام محمد بن حسین السلمی (۴۱۲ھ م)

4۔ تفسیر لطائف الاشارات از امام عبد الکریم بن ہوازن القشیری (۴۶۵ھ م) پر اعتماد کیا۔

5۔ رسالہ قشیریہ از امام عبد الکریم بن ہوازن القشیری (۴۶۵ھ م)

6۔ کشف المحجوب از عثمان بن علی ہجویری 464ھ م

7۔ اِحیاءعلوم الدین از امام محمد بن محمد غزالی 505ھ م

مذکورہ بالا مصادر سے معلوم ہوتا ہے کہ ملا علی قاری نے تمام بنیادی مصادر سے استفادہ کیا ہے۔ متقدمین کو اپنی توضیحات میں مرکزی اہمیت دی ہے۔ مذکورہ مصادر سے ہی بادی الرائی اس تفسیر کی قدر و منزلت واضح ہے۔

اسلوب

اگرچہ ملا علی قاری کے مصادر میں وہی کتب شامل ہیں جن پر معاندین اعتراض کرتے ہیں لیکن علی قاری نے ان کے تطابق اور توافق کی راہ ہموار کرتے ہوئے ان سے استشہاد کیا ہے۔

☆ ظاہری معنی بیان کرنے کے بعد تفسیر اشاری میں بلحاظ ضرورت ظاہری نظم و ترتیب کی توضیح میں لغت، صرف و نحو اور اشعار سے استشہاد کیا ہے۔

☆ تفسیر اشاری کی تائید میں اسلاف تابعین سے استشہاد کیا ہے (تابع و شاہد) لائے ہیں اور جہاں خالی جگہ محسوس ہوئی اس کو پر کرتے ہوئے مندرجہ بالا شرائط سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے۔

☆ ظاہری معنی بیان کرنے کے بعد تفسیر اشاری کے بیان میں ہمیشہ "افاد ، قیل" سے آغاز کیا تاکہ واضح رہے کہ اس سے یہ فکر بھی مراد ہے نہ کے صرف یہی فکر مراد ہے۔

سب سے زیادہ اس تفسیر ملا علی قاری میں (تفسیر قشیری) لطائف الاشارات پر اعتماد کیا ہے جو مقابل تفاسیر کے مقابلے میں نقد کی زد سے محفوظ رہی۔ یہ کہنا بے جانہ ہو گا کہ تفسیر ملا علی قاری، تسہیل تفسیر قشیری ہے بایں معنی کہ کوئی ایک صفحہ بھی اقوال واستشہاد امام قشیری سے خالی نہیں۔ ہر آیت کی تفسیر میں امام قشیری کے اقوال کو لازمی ذکر کرتے ہیں بایں طور کہ امام قشیری کو

ان کے نام سے پکارنے کی بجائے، اسلاف میں سے شیخ علی بن عثمان الہجویری رحمۃ اللہ علیہ (۴۶۵ھ م) کے طریقہ کے مطابق "اُستاد"[10] کہہ کر پکارتے ہیں۔

☆جب آیت کی تفسیر ظاہری و معروف معانی پر ہو رہی ہو تو تفسیر کے تحت "قال الاستاذ" کے الفاظ کیساتھ آیت کی وضاحت فرماتے ہیں۔ جب آیت کی تفسیر پوشیدہ معانی و صوفیانہ طرز پر ہو رہی ہو تو "افاد الاستاذ" کا جملہ استعمال کرتے ہیں۔

☆جب کئی معانی میں سے کوئی معنیٰ راجح و بہتر معلوم ہو رہا ہو تو "مال الاستاذ اور مختار الاستاذ" کا جملہ استعمال کرتے ہیں۔ بہر کیف استاذ قشیری کا مختار قول نقل کرنے کے ساتھ کبھی اپنی رائے بھی دیتے ہیں۔ مزید بر آں، ہر آیت کے تحت جہاں استاد قشیری کے رائے کو جگہ دی گئی وہیں پر تقریباً اکثر مقامات پر مختلف اسلاف بزرگان دین امام جعفر صادق، جنید بغدادی، ابو عثمان المغربی، شیخ عبد القادر جیلانی، سری سقطی، ابن عطاء، امام محاسبی، نصیر آبادی اور واسطی رضی اللہ عنہم جیسے بزرگوں کے اقوال کو ذکر کیا گیا ہے۔ ان اقوال کو اکثر و بیشتر تفسیر سلمی اور قشیری کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے۔

☆قول یا تو نام کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے یا مجملہ "وفی العرائس یا" قال صاحب العرائس "کہہ دیا جاتا ہے۔" قال السُلمی" یا وفی السُلِمی کے الفاظ کے ساتھ توضیح کی جاتی ہے یا" قال سہل" یا "فی التستری" کہہ کر تفسیرِ تستری سے استشہاد کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ "قال بعضھم" اور "قیل" ذکر کر کے بھی اقتباسات و اقوال نقل کیے جاتے ہیں۔

☆مذکورہ تمام صوفیہ کے اقوال کو بلکل ویسے ہی اقتباساً نقل کر دیا جاتا ہے یا اس کے ما حاصل کو اپنے الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے یا پوری بات ذکر کرنے کے بعد آخر میں اس توضیح کا مصداق اور حوالہ ذکر کیے دیتے ہیں۔ عام طور پر تو ہر ہر آیت کی تفسیر الگ الگ کرتے ہیں اور اس کے متعلقہ توضیحی اقوال بھی الگ الگ ذکر کرتے ہیں لیکن کبھی کبھار یکسانیتِ موضوع کی وجہ سے تین، چار آیات کی تفسیر اور ان کے متعلق اشاری اقوال کو اکٹھا بھی ذکر کر دیتے ہیں۔

☆اگر ان کی عبارت میں کچھ غموض و ثِقل ہو تو اس کی "اِنْتَھٰی" یعنی کلام ختم ہونے کی طرف اشارہ کے لفظ کے بعد " وَتَوْضِیْحہٗ" کے لفظ سے وضاحت بیان فرما دیتے ہیں۔

☆مزید بر آں عقلی و نقلی دلائل کی جہاں ضرورت محسوس کی ملا علی قاری نے وہاں دلائل کے ساتھ اپنی رائے کو بھی ذکر کیا ہے۔

ملا علی قاری تفسیر اشارہ کے سلسلے میں منفرد و مبتکر اسلوب بیان کے حامل ہیں۔ یہاں ملا علی قاری کے بیان کردہ تفسیری نکات کے مظاہر، امثلہ، خصائص وامتیازات پیش کیے جائیں گے۔

''يَابَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ''(11)

عرفی تفسیر بیان کردینے کے بعد ملا علی قاری اپنی تفسیر انوار القرآن واسرار الفرقان میں تفسیر اشاری بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

استاد قشیری نے فائدہ بیان فرمایا۔ علماء کے نزدیک نعمت کی حقیقت، ملاوٹ سے پاک خالص لذت ہے۔ جبکہ معرفت وحقائق والوں کے نزدیک جو تجھے عطا کی ہوئی نعمتوں یا مُنْعِم (نعمتیں عطا کرنے والے اللہ) کی یاد دلائے اور تجھ کو بغیر رکاوٹ کے تیرا اس تک وصل کروادے وہ حقیقی نعمت ہے۔ ایک تقسیم یوں بھی کی گئی کہ ایک نعمت ظاہری وحسی ہوتی ہے جبکہ دوسری پوشیدہ اور غیر حسی ہوتی ہے۔ پہلی قسم سے مراد راحتیں اور سکون ہیں۔ دوسری قسم سے مکاشفات ومشاہدات کی مختلف صورتیں مراد ہیں۔ یہ بھی قبول کیا جا سکتا ہے کہ بنی اسرائیل کو نعمتیں یاد کرنے کا حکم تھا جبکہ اُمتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو "منعِم "نعمتیں نچھاور کرنے والے کو یاد کرنے کا حکم ہے۔ آیت "فاذکرونی اذکرکم "میں یہی مضمون ہے۔

تفسیر سلمی میں ہے کہ بنی اسرائیل کو نعمتیں یاد کرنے کا پابند کیا گیا تاکہ وہ نعمتوں کو دیکھ کر منعِم کو جان سکیں۔ لیکن اس اُمت سے یہ حکم اُٹھالیا گیا (اور حکم یہ ہے) کہ اُمت محمدی منعِم کی معرفت سے نعمت کو جانیں۔

اس میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ اُمت مجذوب مسلوک اور مراد ہے، جبکہ ان کے علاوہ سارے سالک، حق کے متلاشی اور مرید ہیں۔ اس میں یہ نکتہ بھی ہے کہ جب کہا "فاذکرونی" مجھے یاد کرو اور یوں نہیں کہا کہ میری نعمتوں کو یاد کرو (ایسا کہنے کی وجہ یہ ہے) تاکہ (منعِم) نعمت بانٹنے والی ذات سے محبت رہے نا کے انعامات اور باقی فرصتوں کے ساتھ۔(12)

''بَلَى مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ''(13)

ہاں! جس نے اپنا چہرہ اللہ کے لیے جھکا دیا یعنی خود کو اللہ کے سپرد کر دیا تو وہ صاحب احسان ہو گیا۔ اس کا اجر اس کے رب کے پاس اس طرح سے ہو گا کہ اس پر کسی قسم کا کوئی خوف نہیں ہو گا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔

جس نے اپنے اِرادہ وخیال کو اللہ کیلئے خالص کر لیا اور اپنی توجہ کو اس کے لیے یکسو کر دیا اور اپنی عقل اور قصد کو عیوب سے اس طرح پاک کر لیا گویا وہ "محسن" ہے۔(احسان کی حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے)وہ جو کرتا ہے اور استعمال کرتا ہے اس میں اس خدا کی حقیقت کو جاننے والا ہے۔ یا تنگ وخوشحال حالات میں اس کے مشاہدے میں رہنے والا ہے جیسا کہ کہا گیا ہے

''ان تعبد الله كانك تراه''[14]

(احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کر گویا تو اس کو دیکھ رہا ہے۔)

گویا وہ ظاہری طور پر اس خدا کے اسرار کے سامنے سجود و سعی کیساتھ سر خم کرنے والا ہے اور باطن میں کشف وجود کیساتھ مشاہدہ کرنے والا ہے۔ پابندگی واطاعت کو لازم پکڑنے والا اور خدمت و حضوری کے آداب کو اس طرح قائم کرنے والا کہ وہ حضوری کے آداب کو اچھی طرح کرنے والا ہو۔ پس ایسے لوگوں پر کوئی جدائی و ہجر کا خوف نہ ہو گا اور نہ ہی ان کو کوئی مخفی مکر لاحق ہو گا۔ نہ ان کو اپنے رب کے مشاہدہ سے دنیا مشغول کر سکی اور نہ ہی آخرت میں ان کو اپنے رب کی رویت سے کوئی چیز روکنے والی ہو گی۔[15]

''وَلِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ''[16]

اللہ ہی کیلئے مشرق و مغرب یعنی اسی کی ملکیت و بادشاہت ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ تمام اطراف سے زمین کے تمام گوشے اسی کیلئے ہے یعنی ساری کی ساری زمین اس کیلئے ہے، اس اللہ کے ساتھ یا اس سے کوئی جگہ خاص نہیں ہے۔ (اس کے جلوے ہر جگہ موجود ہے)۔ پس اگر تم کو حسد کی بناء پر مساجد میں جانے سے روک دیا جائے تو جہاں آسانی میسّر آئے وہاں نماز پڑھ لیا کرو۔ کیونکہ تمہارے لیے ساری زمین پاک اور سجدہ گاہ بنادی گئی ہے۔ پس جب تم بیت المقدس سے کعبۃ اللہ اور قبلہ کی طرف منہ پھیرو تو، (جان لو) کہ اسی جہت (قبلہ) میں بھی اسی طرح اللہ کی ذات کے جلوے ہیں جس طرح سے پہلے قبلہ بیت المقدس میں تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ متوجہ ہونے کا محل کوئی مسجد، جگہ یا ٹکرا نہیں (یعنی اس کی ذات کے جلوے مسجد و مکان کے ساتھ خاص نہیں ہیں)۔ ہر مکان و زمان میں اس کی ذات یکسر ہے کہ اس کی طرف توجہ کرنا مناسب ہے۔ (یاد رہے) کہ وہ ذات مرورِ زمانہ اور کسی (چیز و جگہ) میں حلول کرنے سے پاک ہے۔

تفسیر سلمی میں ہے کہ منصور نے کہا: جہاں بھی تو دیکھے اسی کے ذات کے جلوے ہیں۔ جہاں بھی تو قصد کرے اسی کے ہر طرف قصد اور اردے ہیں۔ یہ بھی کہا کہ مخلوق کے اعتبار سے حق تعالیٰ کاوجود چاند کی طرح ہے جو ہر راستے میں برابر درست وسالم دیکھا جاسکتا ہے۔

امام قشیری کے نزدیک اس آیت میں دِلوں کی مشرقوں اور مغربوں کی طرف اِشارہ ہے اور دلوں کے سورج بھی ہوتے ہیں اور کچھ ستارے بھی۔ پس دلوں کے ستارے نفوس کے ایسے وسوسے ہیں جو آرزوویں اور خواہشات کی تاریکیوں میں ہانکتے ہیں۔ اور دلوں کے آفتاب، وہ علوم کے ستارے، حضوری کے چاند اور مغفرت کے منابع ہیں۔ پس جب تک آفتاب طلوع رہتے ہیں دِلوں کا قبلہ واضح اور ظاہر رہتا ہے اور جب معارف وحقائق آپڑتے ہیں تو آفتاب کی سلطنت ان ستاروں کی طرح مانند پڑ جاتی ہے جو سورج کے طلوع ہونے سے چھپ جاتے ہیں۔ اسی طرح جب حق تعالیٰ کا ظہور ہو جائے تب تو تمام نظام میں ہلچل وزلزلہ آجاتا ہے۔ کوئی (مشرق ومغرب) کی نشانی وعلامت باقی نہیں رہتی، نہ ہی فہم اور حِس باقی رہتی ہے، نہ ہی عقل اور علم کی شہنشاہی، نہ ہی وجدان ومعرفت کی روشنی اور نہ ہی بشری صفات باقی رہتی ہیں۔ (اسی طرح) جب طالب ومرید صفات کی بقاء میں محو ہو جاتا ہے تب وہ حسیّت اور امتیاز گی میں باقی رہتا ہے۔

(یعنی جسمانی وظاہری طور پر قائم رہتا ہے لیکن پوشیدہ طور پر وہ محو اور فنا ہو چکا ہوتا ہے)۔ پس اسی حالت میں قبلہ اس کا مقصد ومطلوب تو ہوتا ہے جبکہ اس کو (ذات کے جلوؤں میں) معلوم نہیں ہو پاتا۔

صاحب عرائس فرماتے ہیں: تم جہاں کہیں بھی اسرار کی آنکھوں کیساتھ چلو پھرو، پس تم انوار کھلتے ہوئے پاؤ گے۔ اِس آیت میں موجودات میں حق تعالیٰ کے جلوؤں کی طرف اِشارہ ہے جیسا کہ اللہ نے اپنے خلیل ابراہیم کے لیے اس معاملہ کو منکشف فرمایا جب اس نے کائنات کے دائرہ میں دیکھا اور کہہ دیا کہ یہ میرا ربّ ہے۔

اس آیت کی تفہیم یہ ہے کہ جس شخص نے (موجودات) کو عقل کی آنکھ سے دیکھا، پس اس کا قبلہ ظاہری نظر آنے والی نشانیاں ہیں جس نے دل کی آنکھ سے دیکھا اس کا قبلہ حق تعالیٰ کی صفات ہیں۔ جس نے روح کی آنکھ سے دیکھا اس کا قبلہ (جلوہ) ذات باری تعالیٰ اور جس نے اِسرار کی آنکھ سے دیکھا پس اس کا قبلہ کائنات سے محو ہوتا ہے۔ (17)

"وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِلنَّاسِ وَأَمْنًا"(18)

(اس وقت کو یاد کرو) جب ہم نے بیت اللہ "جس کو غلبہ کی بناء پر کعبہ کے نام سے پکارا جاتا ہے" اس کو لوگوں کیلئے لوٹنے کی جگہ اور ایسے مومنین کیلئے جو حج و طواف کرتے ہیں ان کے لیے عذاب سے مامون جگہ بنایا۔ یا تو وہ ظاہری سفر کر کے اس تک آتے ہیں یا مخفی و باطنی سفر کے ذریعے اس تک آتے ہیں۔ یا وہ ثواب کی جگہ ہے بایں طور کہ لوگ حج و عمرہ کیلئے اس کی طرف متوجہ ہو کر اپنی عبادت میں ثواب حاصل کرتے ہیں۔

تفسیر سلمی میں ہے: (مَثَابَةً) گناہگاروں کی جائے پناہ اور (امنًا) نیک وکاروں میں سے اس جگہ میں داخل ہونے والوں کیلئے امن کی جگہ ہے۔

امام صادق کہتے ہیں: بیت سے مراد یہاں ذاتِ محمد (ﷺ) ہے۔ جو ان کی رسالت کی تصدیق کیساتھ ان پر ایمان لایا وہ امن اور امانت کی وادیوں میں داخل ہو گیا۔

شاید اس اِشارہ کی توجیہ، عبارت کی تطبیق میں ہے۔ وہ اس طرح کہ یوں عبارت مقدر تشکیل دی جائے "إِذْ جَعَلْنَا بَيْتَ مُحّمد" کیوں کہ اللہ تو مکان اور احاطہِ ارکان سے پاک ہے۔ اور "بیت" کی آپ ﷺ کے ساتھ اس اضافت کو خاص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو خاتم المرسلین کے علاوہ کوئی بھی اس نسبت کا مصداق نہیں بن سکتا۔ اس میں اس مخفی نکتہ کیطرف بھی اشارہ ہے کہ آپ کی اضافت والی نسبت (اللہ کیساتھ) خاص قرب و حضور میں اتمّ اور اکمل ہے۔ اسی نسبتِ تامہ کی وجہ سے تو یوں کہا کہ

"إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ"

جو رسول کی اطاعت کرے گا وہ اللہ کی اطاعت کرے گا اور اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ کے اوپر ہے۔[19]

"قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ"

(اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو۔)[20]

ان مثالوں سے ظاہر ہوا کہ رسول کا گھر، اللہ کا گھر ہے۔ اسی طرح رسول کی دعوت، اللہ کی دعوت ہے۔ آپ کی اطاعت، اللہ کی اطاعت ہے۔ آپ کی نافرمانی، اللہ کی نافرمانی ہے۔ اگر آپ ﷺ نہ ہوتے تو وہ گھر جو لوگوں کیلئے قیام گاہ ہے وہ بھی نہ پایا جاتا، اور مخلوق کیلئے اس میں کوئی مانوسیت بھی نہ ہوتی۔ گویا اللہ کا گھر، رسول کا گھر ہے اور رسول کا گھر اسکا نائب ہے۔ اسی لیے رسول تک پہنچے بغیر اس کے گھر میں داخل ہونے سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ اس معنی کے علاوہ ایک

صوفیانہ نکتہ یہ بھی ہے کہ ابراہیم غالب و اتم قربت کے محل میں تھے ، بایں طور کہ تعمیر کعبہ میں ابراہیمی بنیاد، رب العزت کے قدیم وازلی نقشہ کے عین مطابق تھی۔ پس اللہ ہی معرفت کی حقیقتیں اور وہ لطافتیں جو امام صادق سے صادر ہوئی ان کو زیادہ بہتر جانتا ہے۔ امام صادق وہ امام ہیں جو صدیق اکبر رضی اللہ کی نسل سے ہیں اور صوری و معنوی خلافت و امامت کے حق دار تھے۔

اُستاد قشیری نے اس آیت سے افادہ کرتے ہوئے فرمایا: وہ بیت ایسا ہے جس کو پتھر سے بنایا گیا ہے، لیکن اس کی اضافت و نسبت، قضاء و تقدیر کے معاملات میں ہیشگی و دوام (والی ذات) کی طرف ہے۔ جس نے کعبہ کی طرف اس نظر سے دیکھا کہ وہ تو مخلوق ہے وہ بھٹک گیا، اور ہمارے راستے سے جدا ہو گیا۔ جس نے نسبت ملحوظ رکھتے ہوئے اسکی طرف دیکھا، وہ کمال وصل پا گیا۔ جس نے اس عظیم المرتبت کعبہ کی پناہ لی، وہ آخرت کی سزا سے مامون و محفوظ ہو گیا۔ یہ حفاظت تب میسر آئے گی جب اس نے عظمت و احترام کعبہ اور گناہوں سے توبہ کی نیت سے پناہ لی ہو گی۔

کہا جاتا ہے کہ بیت اللہ کو پتھر سے بنایا گیا ہے۔ لیکن وہ ایسا پتھر ہے جو دِلوں کو علّام الغیوب کی طرف مائل کرتا ہے۔ بالکل اس مقناطیس کی طرح جو کشش والے لوہے کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ بہر حال وہ ایسا گھر ہے جس پر اس کا سایہ پڑ گیا اس پر حفاظت کا میدان اور امن کی راحت ظاہر ہو گی۔ اور جس پر ایک گوشہ یا کنارہ بھی واقع ہوا اس پر بخشش کی بشارت ہو گئی۔ جس نے اس کا طواف اس طرح کیا کہ اس کے دل کے لطائف نے اپنے رب کے لطائف کا طواف کیا، تو پس اس کا طواف اتنا ہی پُر لطف طواف ہے اور اس کا چکر اتنا ہی پُر لطف چکر ہے۔ کیونکہ

هل جزاء الإحسان إلّا الإحسان[21] احسان کا بدلہ احسان ہی ہوتا ہے۔

وہ ایسا گھر ہے جس نے اس کا مشاہدہ کیا تو وہ اپنے ظاہری ہیئت کے ماسوا اپنا سب کچھ معدوم کر بیٹھا اور اپنے نفس کے گھر کو بھول گیا۔ جس نے اس کی زیارت کی وہ دوسری زیارت گاہ بھول گیا اور اس سے ہجرت کر گیا۔ ایسا گھر ہے جس نے اس تک پہنچنے کیلئے مال خرچ کیا اس کو گھاٹا نہ ہوا، جس نے بخل کرتے ہوئے خرچ نہ کیا اس کو کوئی فائدہ نہ پہنچا۔ اس گھر کی مسافت تھکاتی نہیں ہے اور ہجوم و خوف کی وجہ سے اس کی زیارت کو ترک نہیں کیا جاتا۔ ایسا گھر ہے فقر کی وجہ سے (اس تک نہ پہنچنے میں) نرمی و معافی نہیں ملے گی۔ جو شخص اس کی زیارت سے پیچھے رہا یا محبت کی کمی کی وجہ سے، عدم میلان و جوش کی وجہ سے، اور بلا ضرورت اس سے رُکا رہا پس اس کا دل پتھر سے بھی سخت ہو گیا۔ وہ ایسا گھر ہے جس پر اس کے انوار کی شعاع واقع ہوئی وہ سورج و چاند سے بے نیاز

ہو گیا۔ اس شخص پر تعجب نہیں جو اس سے دور رہا کہ وہ کیسے صبر کیے رہا؟ تعجب تو اس پر ہے جو اس گھر حاضر ہوا اور واپس کیسے لوٹ آیا؟[22]

"وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا"[23]

اُستاد قشیری نے اس کی توضیح میں یوں فرمایا: "وسط" پسندیدہ و مختار کو کہتے ہیں۔ پس اللہ نے اس اُمت کو پسندیدہ اُمت بنایا اور اہل معرفت کے گروہ کو اس اُمت سے پسندیدہ و منتخب فرمایا۔ لہٰذا وہ خیار الخیار ٹھہرے۔ پس جب یہ اُمت بروزِ قیامت دوسری اُمتوں پر گواہ و محافظ ہو گی تو وہ اہلِ معرفت و حقائق جو اصل ہیں اور جن پر معاملات کی مدار ہے، اللہ ان کے ذریعے سے تمام اُمت کے معاملات کی (قیامت کے روز) حفاظت فرمائے گا۔ یعنی ان کی گواہی سے اقوام کا معاملہ فرمائے گا۔ پس جس کو ان کے دل قبول کریں گے وہ عند اللہ بھی مقبول ہوں گے اور جس کو وہ ردّ کریں گے وہ مردود ہوں گے۔ پس ان کے لیے دانائی ہو گی، ان کی فراست راست ہو گی، فیصلے صحیح ہوں گے اور ان کی نظر درستگی والی ہو گی۔ (کیونکہ جب) اللہ نے اُمت محمدیہ ﷺ کو خطا پر اتفاق کرنے سے محفوظ کر رکھا ہے تو اُمتِ محمدیہ ﷺ میں اس اہل حقائق کے گروہ کو نظر کی خطا اور ردّ و قبول کے اوامر سے بھی محفوظ رکھا ہے۔ پھر ان کے معاملہ کی بنیاد رسول اللہ سے منسوب ہوتی ہے۔ پس جو کوئی رسول اللہ کی اقتداء و طریقہ پر نہ ہو وہ اِن اہل حقائق کے ہاں مردود ہوتا ہے اور اس پر کچھ روا نہیں رکھا جاتا۔[24]

اس میں اس حدیث کے مضمون کی طرف اشارہ ہے جس میں امت محمدیہ میں ستر یا سات سو لوگ ایسے ہوں گے جن کو اللہ نور کے منبروں پر بٹھائے گا اور ان کی شفاعت لوگوں کے حق میں قبول فرمائے گا۔[25]

"وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ"[26]

صاحب عرائس کہتے ہیں: جس طرح ہر ایک نفس کے لیے توجہ کی ایک (سمت) مقرر ہے۔ اسی طرح ہر روح کا بھی کوئی نہ کوئی قبلہ، وجود ذات میں عروج کی جگہ، اور صفات کے حقائق میں راستہ ہوتا ہے۔ پاکیزہ ارواح کا قبلہ عینِ ذات حق ہوتی ہے۔ برتر ارواح کا قبلہ صفاتِ حق ہوتی ہیں۔ بدلتی (مشاہدات میں ترقی کرتی) ارواح کا قبلہ قدیم ذات ہوتی ہے۔ بقاء والی ارواح کا قبلہ ازلی ذاتِ حق ہوتی ہے۔ سبقت کرنے والی ارواح کا قبلہ مشاہدہ میں آنے والے انوار ہوتے ہیں۔ مانوس

روحوں کا قبلہ کامل صفاتِ حق ہوتی ہیں۔ روحانیت سے منور ارواح کا قبلہ غیب کے باغوں کی عمدہ خوشبو ہوتی ہے۔ (ہر قسم کی ارواح کیلئے قبلہ و مرجع ہوتا ہے) جس کی طرف شوق اور جذب کی کیفیت، اور خیالِ عشق کے ساتھ الوہی خزانوں میں رحمانیت (رحم کرنے والی) سے متصف ارواح قصد اور رجوع کرتی ہیں۔ ان ارواح میں سے ہر ایک والہانہ انداز میں، یا بعض شوق کے ساتھ یا عشق و اُنسیت کیساتھ یا فناء وبقاء کی کیفیت کیساتھ یا حضوری و مصاحبت کیساتھ یا مقامات یا مغیبات کا ادراک کرنے کیساتھ، معاینہ میں حد درجہ تک بڑھنے کیساتھ، مقاماتِ خاص میں خوف کی وجہ سے سکر کی حالت میں (کسی نہ کسی طرح) اِسی ذات و صفات کو اپنا مطلع و منبع اور لوٹنے کا مرکز بنائے ہوئے ہے۔(فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ) کیونکہ تم انتہاء کو پانے والے ہو، لہٰذا اے اہل استقامت تم عمدہ ارواح کی طرف پھر جاؤ(سبقت کر جاؤ)۔ کیونکہ وہی ارواح ہیں جو اعلیٰ درجات پانے والی ہیں (تم تو اس کے لیے پھرنا چاہیے)۔ جبکہ درمیانی و متوسط ارواح تو ارادت کے ہی محل میں ہیں۔

پس اس آیت میں اِشارہ ہے کہ اللہ فرماتا ہے کہ میری ذات سے ہر قوم ایسی چیز کیساتھ مشغول ہو جائے گی جو کہ ان کے اور ہمارے درمیان حائل ہونے والی ہو گی۔ لہٰذا اے مومنو! تم ہمارے لیے ہمارے ساتھ قائم رہنے والے رہنا۔

بعض نے شعر کہا ہے کہ

إذ اشتغل اللاهون عنک بشغلهم　　　جعلت اشتغالی فیک منتهی شغلی

(جب مجھے رسوائی اغیار کے شغل کے ذریعے سے تیری ذات سے مشغول کرتی ہے)

تو میں اپنی سوچ و شغل کا محور تجھ کو بنا لیتا ہوں جس کی وجہ سے میں سارے شغل و مصروفیات کو بھول جاتا ہوں۔[27]

"يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ"[28]

اے ایمان والو: تم پر اسی طرح روزے فرض کیے گئے جس طرح تم سے پہلے انبیاء کرام آدم یا نوح یا دونوں پر یا اہلِ کتاب اور اہل خطاب پر فرض کیے گئے۔ تا کہ تم آگ اور نافرمانی سے بچ جاؤ۔ پہلے لوگوں سے تشبیہ محض روزے کی اصل واضح کرنے کیلئے ہے نہ کہ بلکل انہی کے طریق اور خصوصیت دینے کیلئے۔ تشبیہ حکم کو پختہ کرنے کیلئے بھی ہے، ترغیب دلانے اور پختہ عزم بنانے کیلئے بھی ہے۔

لغت میں "صوم" ہر جاری شئے سے رُکنے کو کہتے ہیں۔ طریقت میں ہر اس چیز سے جو نفس اور خواہش کی طرف (دعوت دے) جھگڑا کرے اور تصوف و حقیقت میں مولٰی کے ماسوا ہر کسی کے ذکر اس سے رکنا صوم ہے، جب کہ شریعت میں نیت کر کے کھانے پینے سے سے رکنا صوم ہے۔ بلاشبہ صوم اس شہوت کو کاٹتا ہے جو جنت تک پہنچنے سے روکنے والی ہوتی ہے۔ روزہ کو ڈھال سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔(29)

اُستاد قشیری نے فائدہ بیان فرمایا: روزے کی دو اقسام ہیں ظاہری، باطنی۔ ظاہری تو یہ کہ نیت کر کے کھانے پینے سے رُک جانا اور باطنی یہ کہ دل کو آفات و فتنہ سے، روح کو کسی جگہ قرار پکڑنے سے، دل کو اغیار کی طرف دیکھنے سے محفوظ رکھنا۔ کہا جاتا ہے کہ عابد لوگوں کا روزہ تب کامل ہوتا ہے جب زبان غیبت سے اور تفکر و نظر اغیار نیز ہر قسم کے شک وشبہ سے خالی ہو۔ اسی طرح حدیث میں بھی مفہوم ملتا ہے کہ جو روزہ رکھے اس کو چاہیے کہ وہ سماعت و بصارت کا روزہ بھی رکھے۔

پس عارفین کا روزہ اغیار کے مشاہدہ سے اسرار کو محفوظ اور روکے رکھنا ہے۔ پس جو شخص کھانے پینے سے باز رہنے والا رہا اسکے روزے کی انتہاء و افطار تب تک ہے، جب رات دن پر چھا جائے۔ جو اغیار سے دور رہنے والا روزہ دار ہے، پس اس کے روزے کی انتہاء بغیر کسی رکاوٹ اور پردہ کے حق تعالیٰ کا مشاہدہ کرنا ہے۔ جو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ:

"صُوْمُوالِرُؤْیتہٖ وَافْطِرُوا لِروٴیتہٖ"

(چاند دیکھ کر ہی روزہ رکھو اور دیکھ کر ہی افطار کرو۔)(30)

اہل تصوف کے ہاں " لِرُوْیتہٖ "میں ھاء ضمیر حق سبحانہ کی طرف لوٹ رہی ہے یعنی اپنے روزے حق تعالیٰ کے مشاہدہ سے افطار کرو۔

علماء ظواہر کے نزدیک اس کا معنٰی وہی ہے جو ظاہر ہے اور ما قبل بیان کر دیا گیا ہے۔ جبکہ خواص کا روزہ اور افطار، اللہ کیلئے ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ان کی توجہ اور انکا مشہود اللہ ہوتا ہے۔ اللہ ان پر غالب ہوتا ہے اور وہ اللہ میں فناء ہوتے ہیں۔(31)

"وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ"(32)

فرض حج اور سنّت موکدہ عمرہ کو اللہ کیلئے پورا کرو۔ یعنی اس طرح مخلص ہو کر کرو کہ جس میں ریاء و شہرت نہ ہو اور معصیت بھی نہ ہو۔ "اتمام" سے مراد انکی شرائط، ارکان، واجبات، مستحبات کو پورے طور کرنا اور مفسدات، محرمات اور مکروہات سے دور رہنا مراد ہے۔

حج اِرادہ کا نام ہے پس قصد واِرادہ حق تعالیٰ کے گھر کا بھی ہوتا ہے اور حق تعالیٰ کی ذات کا بھی۔

پس پہلا قصد عوام کا حج ہے جبکہ دوسرا قصد خواص کا حج ہے۔ اسی طرح جو اپنی ذات سے حج کرتا ہے وہ احرام باندھتا ہے، بیت اللہ کا طواف کرتا ہے، سعی و حلق کرواتا ہے۔ جبکہ جو دل سے حج کرتا ہے وہ واضح و صریح اِرادے پر کمر باندھتا ہے (حق تعالیٰ کی ذات میں توجہ مرکوز کرتا ہے)۔ بایں طور کہ اس کے مخالف عوارض اور معاملات سے الگ ہوتا ہے۔ پھر اپنے لباس کو برداشت اور فقر سے مزین کرتا ہے اور نفس کی پیروی سے اپنے آپ کو روکتا ہے اور آرزوؤں کو چھوڑ دیتا ہے۔ بہر حال (ظاہری طور) حج کرنے والا غبار آلود ہوتا ہے، اس پر خشوع و خضوع کے اسرار و انوار ظاہر ہوتے ہیں اور اس کے ہر ہر حصے سے "تلبیہ" کے اسرار و عیاں ہوتے ہیں۔ اسی طرح (ظاہری) افضل حج اس کو قرار دیا جاتا ہے جس مین ذبیحہ کا خون بہایا جائے اور بلند آواز سے تلبیہ کہا جائے۔

جب کہ (باطنی طریقہ کا حج) نفس کے خون کو خواہشات کی مخالفت والی چھری کیساتھ بہانا اور دائمی استغاثہ اور بہترین قرب کیساتھ پوشیدہ (اسرار) کی آواز کو بڑھانا، اور ہیبت و خوف کے اوصاف سے متصف ہو کر قرب کی وادیوں میں قیام کرنا ہے۔ مزید براں نفس کی قیام گاہ عرفات کا میدان ہوتا ہے، جبکہ دل کی قیام گاہ ربّ العزت کے وصل سے صفات اور نشانیاں ہوتی ہیں۔ (اِسی طرح) دلوں کا طواف رب العزت کے جلوؤں کے قرب و مشاہدہ کے گرد ہوتا ہے اور سعی جلال و جمال والے لطائف کے درمیان خاص اسرار کیساتھ ہوتی ہے۔ پھر احرام سے باہر آنا (باطنی احرام گھولنا) آرزوؤں، معارضات اور تجاوزات کو ختم کرنے کی صورت میں ہوتا ہے۔[33]

''وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ''[34]

اے نبی! وہ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ کتنی مقدار صدقہ کیا کریں۔ آپ ان کو فرما دو، جو اضافی مال ہو۔ بہر حال اسی طرح ماقبل کھلی وضاحت کے ساتھ اللہ باقی واضح احکام بھی تمہارے

لیے بیان فرماتا ہے تا کہ تم احکام و دلائل میں تفکّر کرو۔ "عفو" سے مراد جو پیداوار اور احوال سے آسانی سے میسر ہو۔

عام لوگوں کے حق میں یہ آیت، آیتِ زکوٰۃ کی وجہ سے منسوخ ہے۔ جب کہ خواص کے نزدیک عفو" وہ ہے۔

جو ضرورت و حاجت سے زائد ہے۔ یہ خواص کا طریق ہے کہ وہ زائد مال کو اپنی کفایت سے نکال باہر کرتے ہیں۔ جبکہ خاص الخاص لوگ ایثار پر عمل پیرا ہیں۔ یعنی اپنے غیر کو اپنے نفس پر ترجیح دیتے ہیں، وہ خود فاقہ کرتے ہیں اس وقت تک جب تک (نفس اپنی خواہش سے) باہر نکل نہ جائے۔

عرائس میں ہے: عارفین کے ہاں "عَفْو" ماسوا الحق تعالیٰ ہے۔ یعنی جو چیز بھی انسان کو حق تعالیٰ سے مشغول کرے اگرچہ کتنی ہی ضروری ہو، اس کو چھوڑ دینا چاہیے۔ حتیٰ کہ تمام لوگ جمع ہو کر اس کا عوض بھی بن جائیں، (اے بندے) تب بھی تم اللہ کو مت چھوڑنا۔ پس خواص اپنی پسندیدہ چیزوں کو اپنے رب کی رضا میں خرچ کرتے ہیں اور اپنی خواہش کو ترک کر دیتے ہیں۔ جبکہ عوام اپنے مال کو محفوظ رکھنے اور بڑھنے کی حرص کی وجہ سے خرچ کرتے ہیں۔ (خواص جو خرچ کرتے ہیں) اس کی وجہ یہ ہے کہ حق سبحانہٗ اپنے اولیاء سے مخلوق کی محبت و خواہش، ان کے احوال کو بچانے کے لئے اور ان کے اسرار کی حفاظت کیلئے دور کر چکا ہے۔ [35]

"قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ "[36]

عرائس کی عمدہ باتوں میں سے ہے: اہل معرفت اور اہل محبت کے نزدیک محبت کی حقیقت شوق کی آگ میں دل کو جلانا، عشق کی لذت کے ساتھ روح کو آرام پہنچانا، اپنی ذات کو محبت کے سمندر میں غرق کر دینا، نفس کو پاکیزگی والی نہر سے پاک کرنا، دونوں جہانوں سے اپنی آنکھ کو بند کر لینا اور محبوب کو پوری آنکھ سے دیکھنا ہے اور یہ محبت کی اصل (جڑ) ہے۔ بہر حال محبت کی فرع ان تمام باتوں میں محبوب کی موافقت کرنا جو محبوب کو پسند ہیں، اس کی آزمائش کو خوشی سے قبول کر لینا اور اس کی تقدیر اور اس کے فیصلے کو وفا کی شرط کی رعایت کرتے ہوئے مان لینا اور مصطفیٰ کریم ﷺ کی پیروی کرنا ہے۔ بہر حال محبت کرنے والوں کے آداب خواہشات اور لذات سے قطع تعلقی کر لینا، بھلائی اور نیکی کے کاموں میں جلدی کرنا، تنہائی اور لوگوں کی موجودگی میں عاجزی کے

ساتھ رہنا، سانسوں اور لمحات کی حفاظت کرنا، صفات الٰہیہ کی پھیلنے والی خوشبو کو سونگھنا، مناجات کی حالت میں خشوع و خضوع کرنا اور عبادات میں سے نوافل پر بھی ہیشگی اختیار کرنا ہیں یہاں تک کہ وہ مخلوق کے درمیان رہتے ہوئے حق تعالیٰ کی صفات کے ساتھ متصف ہو جاتے ہیں اور حق تعالیٰ کے نور کے ساتھ منور ہو جاتے ہیں اور حدیث قدسی اور مانوس کلام میں ہے :

"میرا بندہ لگاتار نوافل کے ذریعے میرا قرب چاہتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں پس جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو اس کے کان ، آنکھ ، زبان، دل اور قوت والا ہاتھ بن جاتا ہوں۔"(37)

اور محبت خالص نہیں ہوتی مگر اس کے بعد کہ بولنے والی روح باطن کی آنکھ سے جمال اور بہترین ارادت والی صفت کے ساتھ حق کا مشاہدہ کر لے نہ کہ نعمتوں والی صفت کے ساتھ مشاہدہ کرنے سے۔ اس لیے کہ محبت جب نعمتوں کو دیکھنے کی وجہ سے ہو تو یہ معلول محبت (ایسی محبت جو کہ کسی علت اور سبب کی وجہ سے کی جائے) ہو گی حالانکہ حقیقی محبت وہ ہے کہ جس میں محبوب اور محب کے درمیان سوائے محبوب کے کوئی علت نہ ہو۔

ابو عمرو بن عثمان مکیؒ نے فرمایا: اللہ کی محبت اس کی معرفت حاصل کرنا، ہمیشہ اس سے ڈرتے رہنا، دل کو اس کے ذکر میں مشغول رکھنا اور اس پر قائم رکھنا اور اس کی محبت اور فکر پر ہیشگی کرنا ہے۔

محمد بن خفیفؒ نے فرمایا: محبت کا مطلب ان تمام معاملات میں اللہ تعالیٰ کی موافقت کرنا ہے جن کو وہ پسند کرتا ہے اور جن سے راضی ہوتا ہے۔

استادؒ نے فائدہ بیان فرمایا : بے شک اللہ کا فرمان "تُحِبُّوْنَ اللهَ" حالت فرق ہے اور "يُحْبِبْكُمُ اللهُ" حالت جمع ہے پہلا یہ علت کے ساتھ ملا ہوا ہے دوسرا "حْبِبْكُمُ الله" بغیر علت کے ہے۔ بلکہ یہ حقیقی تعلق ہے بندوں کی اللہ تعالیٰ سے محبت ایک ایسی پاکیزہ حالت ہے جس کو اس کی راہ میں چلنے والا اپنی ذات میں پاتا ہے یہ حالت ناپسندیدگی کے بغیر خوشی کے ساتھ اللہ کے حکم کی موافقت پر ابھارتی ہے۔ یہ حالت اللہ کی ذات کو ہر شے اور ہر فرد پر ترجیح دینے کا تقاضا کرتی ہے اور محبت کی شرط یہ ہے کہ اس میں اپنے حال کا کوئی حصہ نہ ہو۔ پس جو شخص اپنے حصوں سے کلی طور پر بے نیاز نہیں ہوتا اس کے لیے محبت میں سے کوئی حصہ نہیں ہے۔ اللہ کے اپنے بندے سے محبت کرنے کا مطلب ہے اس کا بندے کے ساتھ بھلائی کرنے، اس پر مہربانی کرنے اور اس پر احسان کا

ارادہ کرنا، اور یہ خاص فضل کا ارادہ ہے۔ پس یہ اس کی ذات کی صفات میں سے ہو گا اور کہا جاتا ہے اپنی ذات کو اپنے محبوب میں فنا کرنے کے لیے تیرا اپنی ذات سے مکمل طور پر مٹ جانا ہے محبت کی شرط ہے۔ حبیب ﷺ اور خلیلؑ کے درمیان یہ فرق ہے۔ خلیلؑ نے کہا" جس نے میری پیروی کی وہ مجھ سے ہے" اور حبیب ﷺ نے کہا" تم میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا" اگر خلیلؑ کی اتباع کرنے والا ان کی ذات سے فضل پاتا ہے تو حبیب ﷺ کی پیروی کرنے والا اللہ کا محبوب بن جاتا ہے انجام کے اعتبار سے۔ یہ قربت اور حال کے لحاظ سے کافی ہے اور بعض صوفیہ نے کہا ہے تمام لوگوں کی خواہشات کو کاٹ دیا کہ کوئی نفس کسی کی بھی فرمانبر داری نہ کرے مگر اس حال میں کہ اس کے رہنما اور امام پہلوں اور بعد والوں کے سر دار محمد ﷺ ہوں۔

صوفیہ کہتے ہیں کہ اس میں اشارہ ہے کہ محبت معلول نہیں ہوتی (اسباب کی وجہ سے نہیں کی جاتی) نہ ہی فرمانبر داری کے لیے ہانکنے والی ہے اور نہ ہی مصیبت سے خالی ہوتی ہے اس لیے کہ فرمایا"یُحْبِبْکُمُ اللهُ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُم "اور واضح کیا کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ بندے کے بہت سار ے گناہ ہوں پھر وہ اللہ سے محبت کرنے لگے اور اللہ بھی اس سے محبت کرنے لگے۔

بعض صوفیہ اس کی توضیح یوں کرتے ہیں: پہلے فرمایا(یُحْبِبْکُم) پھر فرمایا(وَیَغْفِرْ لَکُمْ) او رواؤ ترتیب کا تقاضا کرتی ہے تا کہ معلوم ہو جائے کہ محبت، مغفرت کے لیے جلدی کرنے والی ہے پہلے وہ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اس سے محبت کرتے ہیں پھر وہ ان کو بخش دیتا ہے اور وہ اس سے بخشش طلب کرتے ہیں اور محبت مغفرت کو لازم کرتی ہے نہ کہ معاف کرنا محبت کو لازم کرتا ہے۔ استادؒ کا کلام ختم ہو گیا۔

میرے خیال سے استاد قشیریؒ کی مراد یہ ہے کہ ترتیب ذکری، ترتیب وجودی کا فائدہ دیتی ہے (یعنی جو چیز ذکر کرنے میں جس طرح ہے، پائی جانے میں بھی اسی ترتیب سے ہے)۔ اس کے علاوہ دوسرے معنی سے روکنے والی بھی کوئی چیز نہیں ہے کہ واؤ مطلق جمع کے لیے ہو اس لیے کہ اللہ توبہ کرنے والوں اور خوب پاک رہنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ سب سے پہلے گناہگار محبت کرنے والے کی توبہ اور مغفرت کے دوسرے اسباب پر مدد فرماتا ہے پھر اس کو محبوبیت والا مرتبہ عطا فرماتا ہے اس لیے کہ یہ مرتبہ اتباع کرنے کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔[38]

''أَيْنَمَا تَكُونُوا يُدْرِكْكُمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِي بُرُوجٍ مُشَيَّدَةٍ''[39]

تم جہاں کہیں بھی ہو اور چاہے موت کا تصور نہ بھی کرو موت تمہیں آ پکڑے گی اگر چہ

تم بلند وبالا محلات میں ہو یا چونے اور گچ سے بنے قلعوں میں۔

ظاہری حکم مخالفین کو ڈرانا ہے جبکہ باطنی حکم مشتاق لوگوں کو بدلہ دینا ہے کہ اے میری ملاقات کا شوق رکھنے والو! بے شک جو تم میرے بارے میں گمان رکھتے ہو میں اس سے اچھا بدلہ تمہیں عطا کروں گا۔ پس میں تمہیں دنیا کے قید خانہ سے چھٹکارا دے کر آخرت میں اپنی ملاقات کی مجلس تک پہنچا دوں گا۔ تم جہاں کہیں بھی ہو میں تمہارے ساتھ ہوں۔ جب ملاقات کا وقت آئے گا تو میں تمہیں موت کے ہاتھوں سے چھین لوں گا اور تمہاری موت حقیقت میں تمہاری روحوں کا میری زیارت کے لئے نکلنا ہے۔ جیسے مقناطیسی پتھر جب ظاہر ہوتا ہے تو لوہے کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ میرے پیاروں کو خوش خبری دے دو کہ موت ان کے لئے راحت کا سبب ہے اور ان کی موت میری ملاقات کا ذریعہ ہے۔[40]

''فَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ وَمَنْ يُرِدْ أَنْ يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ كَذَٰلِكَ يَجْعَلُ اللَّهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ''[41]

امام سہل رحمۃ اللہ نے فرمایا: بے شک اللہ لوگوں کے دلوں کی طرف توجہ فرماتا ہے۔ پس جو دل اللہ کے لیے بہت زیادہ تواضع والا ہو تو اس کو اپنی ہدایت کے جس درجے کے لئے چاہتا ہے خاص کر دیتا ہے۔ پھر اس کے بعد اس دل کو بھی چُن لیتا ہے جو اللہ کے ماسوا کے ارادہ سے بہت جلد رجوع کرنے والا ہو۔ جس آدمی کا سینہ اللہ ایمان کے لئے کھول دے اس کی نشانی یہ ہے کہ وہ صاحب تقدیر (اللہ) کی تقدیر کے ساتھ اس کے دل میں جھگڑے اور لڑائی کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔ کہا جاتا ہے کہ شرح صدر مخصوص غیبی انوارات سے ہوتا ہے۔ (نور کے تین درجے ہیں) شروع میں جو نور ہوتا ہے وہ عقل کا نور ہوتا ہے۔ درمیانی نور، وہ علم کا نور ہوتا ہے۔ آخر کا نور وہ ہوتا ہے جو معرفت کا نور ہوتا ہے۔ (تو اسے پتہ چلا کہ) عقلمند انسان کا تعلق معرفت کے ساتھ ہے اور اہل علم کا تعلق بیان اور وضاحت کے ساتھ ہے اور اہل معرفت، مشاہدہ کے حکم میں ہیں۔ بعض نے یہ بھی کہا کہ غیبی انوارات کا پہلا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان کو اپنے عیوب اور کوتاہیاں نظر آنا شروع ہوتی ہیں۔ پھر اس کے بعد اس نور کی وجہ سے جو اس کے رب کی طرف سے دل پہ اثر انداز ہوتا ہے، وہ اپنے نفس کو سر فہرست و اعلیٰ سمجھنے سے مشغول و دور ہو جاتا ہے۔ پھر اس کے اسرار و رموز پر انوارات کا فیضان ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ اسرار کو پھر دیکھ بھی نہیں سکتا۔ اس کی مثال ایسے جو سورج کی تیز شعاؤں کو (بغور) دیکھے گا، یقینی بات ہے کہ اس تیز ترین شعاؤں کی وجہ سے اپنی آنکھوں کی روشنی

کو بے کار کر دے گا۔ تو عین اسی طرح یہ بھی شہود کے حقائق کے ادراک کی خاطر اپنی بصیرت کی تجلیات اور انوارات کو کھو بیٹھے گا۔ تو پھر اس کو "صاحب وجود" کا مقام دیا جائے گا صاحب شہود" والا نہیں۔ پھر اس کے بعد انسان کلی طور پر ہمیشہ کی صفت سے گمنام ہو جاتا ہے وہ ایک ہو کہ رہ جاتا ہے۔ یہ کلام استاد قشیری کے افادات سے ہے۔ (42)

''وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا يَظْلِمُونَ''(43)

اسکے بر خلاف جسکا نیکیوں کا پلہ گناہوں کی نحوست کی وجہ سے ہلکا پڑا تو وہ ایسے ہیں کہ اس نے گھاٹے میں ڈالا خود اپنے آپ کو۔ یہ خسران اور گھاٹا اسکا بدلہ ہے جو ہماری آیتوں سے زیادتی کرتے تھے۔ اس کتاب کی تصدیق کی بجائے تکذیب کرتے تھے اور یوم حساب کے انکار کی وجہ سے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔

میزان و اعمال کی حالت و کیفیت کیسی ہو گئی اور تولنے کے طرق کیسے ہوں گے اس بارے میں استاد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے۔ ان کے اعمال اخلاص کے میزان کے ساتھ تولے جائیں گے اور ان کے احوال سچائی کے میزان کے ساتھ تولے جائیں گے۔ پس جن کے اعمال ریاکاری والے ہوں گے وہ ہر گز قبول نہیں کیے جائیں گے اور جن کے احوال میں عجب اور واہ واہ لینے کے جذبے کی آمیزش ہو گی ان کی ہر گز ہر گز کوئی قیمت نہیں لگے گی۔

امام سلمی نے فرمایا ہے۔ جو کوئی عدل کے میزان میں اپنے آپ کو تولے گا وہ محبین میں سے ہو گا اور جو کوئی اپنے خیالات اور اپنی سانسوں کو حق کے میزان میں تولے گا تو اسکا مشاہدہ ہی اس کے لیے کافی ہو گا۔ میزان مختلف قسم کے ہوں گے نفس اور روح کے لئے میزان، دل و عقل کے لئے میزان اور معرفت و سر کے لئے میزان۔ پس نفس اور روح کا میزان امر اور نھی کا میزان ہے اور اس کے پلے کتاب اور سنت ہیں اور عقل اور دل کا میزان ثواب اور سزا کا میزان ہے اور اس کے پلے وعدے اور وعیدیں ہیں اور معرفت اور اسرار کا میزان رضا اور ناراضگی کا میزان ہے اور اس کے پلے چھوڑ دینا اور حاصل کر لینا ہے۔ (44)

نفائس العرائس میں ذکر کیا گیا ہے کہ اللہ رب العزت کے بہت سے میزان ہے جس کے ذریعے سے وہ اعمال اور احوال کا وزن کریں گے پس اخلاص کے میزان کے ذریعے سے معاملات کا وزن کریں گے اور سچائی کے میزان کے ذریعے سے حالات کا وزن کریں گے۔ پس ہر عمل جو کسی

غرض یا کسی عوض لینے کی وجہ سے کیا جائے اور ہر وہ عمل جس میں کسی غیر کی نیت کی جائے وہ عمل قبولیت کے درجے سے گر جاتا ہے اور ہر وہ حال جس کو حاصل کرنے والا شخص اگر کسی عجب میں مبتلا ہو جائے تو وہ وصل کے درجہ سے بہت دور جا گرتا ہے۔ پس معاملات کا میزان اخلاص ہے اور حالات کا میزان سچائی ہے پس اس دنیا میں جو کوئی بھی اپنے نفس کو مشقت و مجاہدہ کے میزان میں تولے گا اور اپنے دل کو مراقبات کے میزان میں تولے گا اور اپنی عقل کو عبرت کے میزان میں تولے گا اور اپنے روح کو مقامات کے میزان میں تولے گا اور اپنے لطیف اسرار کو حضوری اور غیب پر مطلع ہوتے ہوئے میزان میں تولے گا اور اپنی صورت کو معاملات کے میزان میں تولے گا جس کے دونوں پلے حقیقت اور طریقت ہیں جس کی زبان شریعت اور اسکے عمود عدل و انصاف ہیں تو اس کا نفس قیامت کے دن شرف کے میزان میں تولا جائے گا اور اسکا دل لطف و کرم کے میزان میں تولا جائے گا اور اس کی عقل نور کے میزان میں تولی جائے گی اور اسکی روح سرور وراحت کے میزان میں تولی جائے گی اور اس کا لطیفہ سر وصل کے میزان میں تولا جائے گا اور اسکی صورت قبولیت کے میزان میں تولی جائے گی۔ پس جب ان چیزوں کے ساتھ جو ہم نے ذکر کی ہیں اس کے میزان میں بھاری ہو جائیں گے تو اس کو اس کی جزا دی جائے گی۔ پس اس کے نفس کے لئے جزا، فراق سے امن کا حاصل ہو جانا ہے اور اس کے دل کے لئے جزا جس مشاہدے کا شوق رکھتا تھا اس کا حاصل ہو جانا ہے اور اسکی عقل کی جزا، ان صفات پر مطلع ہو جانا ہے اور اس کی روح کی جزا، اس کے لئے اس ذات بابرکت کی انورات کا ظاہر ہو جانا ہے۔ ان کے لطیفہ سر کی جزا، قدیم رازوں کا ظاہر ہو جانا ہے۔ اور اس کی شکل وصورت کی جزا اپنے رب کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ وصل کی مجالس کا حاصل ہو جانا ہے۔

مذکورہ محمولات کو ملحوظ رکھتے ہوئے، اے میرے دوست! اس بات کو سمجھو کہ اللہ رب العزت کا بندے کے لئے قیامت والے دن اعمال کے وزن کرنے کی حکمت یہ ہے کہ اللہ رب العزۃ تمہارے سامنے جو کچھ انہوں نے لوح محفوظ میں پیدائش سے پہلے لکھ دیا تھا ظاہر کر دینا چاہتے ہیں اور جو کچھ قضاء و تقدیر اور رضا و ناراضگی اور خوش بختی و بد بختی میں سے لکھ دیا گیا تھا اور اس کے مطابق دنیا میں حالات بھی پیش آئے جسے فرشتوں نے اپنے حساب کتاب کے رجسٹروں میں لکھ لیا تھا (اس کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں)۔ تاکہ اللہ تمہارے ایمان کو اس دلیل اور مشاہدے کے ساتھ مزید بڑھادے اور تم جان لو کہ اللہ کا علم ہر چیز پر محیط ہے۔ یا یہ کہ اللہ حقیقت کو رد کرنے اور اس کو قبول کرنے کی حجت مکمل کرنا چاہتے ہیں اور وہ قادر ہے کہ اعراض کو جواہر کی شکل میں ظاہر کر دے اور

اپنے میزان جس کو وہ قیامت والے دن ظاہر کریں گے اس کے ذریعے سے اس کا وزن کرے۔

بہر حال جس کے بارے میں شریعت کی زبان سے ظاہر کیا جاچکا ہے اس پر ایمان لانا واجب ہے بایں معنی کہ ابن عباس نے فرمایا ہے، کہ نیکیوں اور برائیوں کا ایسے میزان میں وزن کیا جائے گا جس کی زبان ہے اور دو ہتھیلیاں ہیں پس جہاں تک مومن کی بات ہے تو اس کے عمل کو اچھی صورت میں پیش کیا جائے گا اور اس کے عمل کو میزان کے پلا میں رکھا جائے گا پس اس کی نیکیاں برائیوں پر وزنی ہو جائیں گی پس اس کے عمل کو جنت میں رکھا جائے گا پس وہ مومن اپنے عمل کو پہچان لے گا۔[45]

''قَالَ يَا قَوْمِ لَيْسَ بِي ضَلَالَةٌ وَلَكِنِّي رَسُولٌ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ''[46]

نوح نے جواب دیا اے میری قوم مجھے کوئی ایسی گمراہی کا ذرہ بھی نہیں لگا جو وبال لانے والا ہو بلکہ میں تو رب العالمین کا بھیجا ہوا پیغمبر اور دین متین اور یقینی کامیابی کے راستے پر ثابت قدم رہنے والا ہوں۔

جب نوح کو گمراہی کی طرف منسوب کیا گیا تو انھوں نے اس کا جواب خود اپنے کلام سے دیا کہ مجھے کوئی گمراہی نہیں لگے اور جب ہمارے نبی ﷺ کی طرف گمراہی کی نسبت کی گئی تو اسکا رد خود اللہ نے کیا اور فرمایا:

''مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَى''[47]

(کہ تمہارے ساتھ رہنے والے صاحب نہ راستہ بھولے ہیں اور نہ ہی بھٹکے ہیں۔)

چنانچہ بڑا فرق ہے کہ کوئی خود اپنی صفائی پیش کرے اور دوسرا وہ جس کی صفائی اسکا رب پیش کرے۔

میں (ملا علی قاری) کہتا ہوں کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نوح طالب ہیں اور راستے کے مسافر ہیں اور ہمارے نبی منزل اور مراد ہیں۔[48]

''وَعَلَامَاتٍ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ''[49]

استاد قشیری نے فائدہ بیان فرمایا: آیت بظاہر پہاڑوں کے بارے میں ہے جبکہ اس کا اشارہ اولیاء کی طرف ہے جو مصیبت میں مخلوق کی مدد کرتے ہیں۔ اولیاء اور نیک لوگ رب کی طرف جانے والے راستے ہیں جن کے ذریعے سالک ہدایت پاتا ہے اور ستارے آسمان میں ہوتے ہیں جن سے شیاطین کو بھی مارا جاتا ہے اور ولی اللہ زمین کے ستارے ہوتے ہیں اسی طرح علماء، آئمہ، توحید و

دین بھی کفار و ملحدین کے لئے مار ہیں۔ میرے (علی قاری کے) خیال سے ان دونوں (آسمانوں کے ستارے اور زمین کے ستارے) میں فرق یہ ہے کہ ایک کے ذریعے دنیا کے راستے طے ہوتے ہیں جبکہ دوسرے کے ذریعے رب تعالیٰ کے قرب کی طرف راہ ملتی ہے۔ (50)

بیان کردہ تفسیری نکات و امثلہ میں واضح دیکھا جا سکتا ہے کہ ملا علی قاری نے اپنی تفسیر میں کس قدر جانفشانی سے تفسیر بالاشارہ کی مجوزہ شرائط کی رعایت کرتے ہوئے اس کو مقبول بنانے کی سعی کی۔ امام قشیری، سلمی و دیگر صوفیہ کے اقوال سے استشہاد کو جہاں توضیح و تقویت کی ضرورت تھی اس کو بیشتر طرق، احادیث، قرآن، عوامل اسلاف سے مزین کر کے اس میں موجود ابہام و پیچیدگی کو دور کیا اور اس کو شریعت کے پیرائے میں واضح کرنے کی کوشش کی۔

☆"اہل خواص کے نزدیک اس کا معنی"، "علماء ظاہر کے نزدیک یہ معنی ہے"، "اگرچہ ظاہری معنی مراد لینا بالکل واضح ہے لیکن اہل اشارہ کے نزدیک"، "ظاہری حکم عوام کے لیے ہے جبکہ خاص لوگوں کے اس کا باطنی معنی ہے"، "ایک قصد عوام کا ہے ایک خواص کا"، جیسی جابجا عبارات سے واضح ہوتا ہے کہ، علی قاری نے آیت کریمہ سے اخذ ہونے والے ظاہری مفہوم کی حیثیت کو برقرار رکھا اور اشاری معنی کے بیان کو ثانوی حیثیت دیتے ہوئے قبول کیا ہے۔

☆اسلاف صوفیہ کی واضح عبارات کو بعینیہ تسلیم کرتے ہوئے ذکر کیا ہے جب کہ جہاں مفہوم کو واضح کرنا ضروری سمجھا وہاں وضاحت پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی رائے کا خصوصی اہتمام کیا۔ مستزاد یہ کہ جہاں کہیں علمی و عرفانی نکتہ اخذ ہوتا نظر آیا، اسے اپنے ذوق کے مطابق نہایت دلکشی سے بیان کیا۔

☆امام سلمی، تستری، قشیری فاضل مصنف کے نزدیک ثقہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان سے استشہاد کرنے میں کوئی تردد نہیں کرتے بلکہ امام قشیری کے لیے تو نام لینے کی بجائے استاد کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔

☆ملا علی قاری نے اپنے وقیع علمی رسوخ سے اپنی اس تفسیر کو مقبول بنانے کی کامیاب سعی کی اور صوفیانہ تفسیری ادب میں ایک مبتکر اضلافہ کر کے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔

حوالہ جات وحواشی

1، أنزل القرآن على سبعة أحرف لكل آية منها ظهر وبطن، إسناده حسن / ابن حبان، محمد بن حبان، صحیح ابن حبان، کتاب العلم، باب ذکر العلم التیمن اجلها قال النبیﷺ" وما جہلتم من علمہ فرودوہ الی عالمہ، بیروت: موسسۃ الرسالہ، رقم الحدیث 75

☆نقل السيوطي في الاتقان عن ابن عطاء الله في لطائف المنن ما نصه إعلم أن تفسير هذه الطائفة لكلام الله وكلام رسوله بالمعاني الغريبة ليس إحالة للظاهر عن ظاهره ولكن ظاهر الآية مفهوم منه ما جآءت الآية له ودلت عليه في عرف اللسان ولهم أفهام باطنة تفهم عند الآية والحديث لمن فتح الله قلبه وقد جاء في الحديث لكل آية ظهر وبطن /زرقانی، عبد العظیم، مناہل العرفان، بیروت: مطبع عیسی البابی الحلبی، ج2، ص79،

☆فعن الحسن البصريّ مرسلاً أنّ النبيّ صلى الله عليه وسلم قال : " أنزل القرآن على سبعة أحرف لكل آية ظهر وبطن ولكل حدّ ومطلع " . وروى الطبراني أنّ عبد الله بن مسعود رضي الله عنه قال : إنّ هذا القرآن ليس منه حرف إلا له حدّ ولكل حدّ مطلع وخرّجه صاحب المصابيح والطحاوي في الآثار وفي معنى السبعة أحرف أقوال كثيرة ليس هذا محلها/ خفاجی، احمد بن عمر، حاشیہ الخفاجی علی البیضاوی، بیروت: دار صادر، ج2، ص28

2، ذہبی، محمد حسین، التفسیر والمفسرون، قاہرہ: دار لحدیث، ج2، ص308

3، ابن قیم، ابو عبد اللہ محمد بن ابی بکر، التبیان فی اقسام القران، تحقیق فواد احمد زمرلی، بیروت: دار الکتاب العربی 1994، ص90

4، عبد الملک عصامی شافعی 1111ھ م نے سمط النجوم العوالی والتوالی ص، 394، ج4 میں ملا علی قاری کے والد کا نام ذکر کرتے ہوئے فقط سلطان پر اکتفاء کیا ہے، نیز ابو الفیض مرتضی بلگرامی 1205ھ م نے تاج العروس من جواہر القاموس کے مقدمے ج1، ص3 اور شیخ عبد الحیء لکھنوی نے اپنی کتاب طرب الاماثل بتراجم الافاضل ص225 میں بھی اسی پر اکتفاء کیا ہے، عبد الحلیم چشتی نے اپنی تصنیف البضاعۃ المزجاۃ لمن یطالع المرقاۃ ص1 میں تصریح کی ہے کہ میں نے سندھ میں ٹنڈو سائیں داد کے علاقے میں شیخ ہاشم جان مجددی کے پاس موجود مصحف مخطوط پر ملا علی قاری کی

خطاطی میں علی بن سلطان محمد خود دیکھا ہے، اسی طرح تمام مطبوعات جو آستانہ، مصر اور ہند میں شائع ہوئیں ان پر بھی ایسے ہی ہے،

5، چشتی، عبدالحلیم، البضاعۃ المزجاۃ لمن یطالع المرقاۃ، ملتان: مکتبہ امداد العلوم، ج1، ص1

6، لکھنوی، عبدالحیٔ بن عبدالحلیم، التعلیقات السنیۃ علی الفوائد البھیۃ، ص:8

7، شوقی، ابو خلیل، اطلس التاریخ العربی الاسلامی، دمشق: دارالفکر، ص19،21

8، بیگ، مرزا مقبول، ادب نامہ ایران، لاہور: یونیورسٹی بک ایجنسی، ص484

9، لکھنوی، عبدالحیءبن عبدالحلیم، التعلیقات السنیہ علی الفوائد البھیہ، کراچی: قدیمی کتب خانہ، ص8 / المحبی، محمد امین فضل اللہ، خلاصۃ الاثر فی اعیان القرن الحادی عشر، بیروت: المطبعۃ الوھبیہ، 1284ھ، ج3، ص185 /

10، ہجویری، علی بن عثمان، کشف المحجوب، تحقیق دکتر محمد حسین تسبیحی، اسلام آباد: انتشارات مرکز تحقیقات فارسی ایران وپاکستان، ص32

11، البقرۃ:40

12، القاری، علی بن سلطان، تفسیر ملا علی قاری، کوئٹہ: مکتبۃ المعروفیہ، 2013، ج ا، ص:64

13، البقرہ:112

14، البخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، کتاب الایمان، باب سوال جبریل، رقم الحدیث:۵۰

15، القاری، علی بن سلطان، تفسیر ملا علی قاری، ج ا، ص:106

16، البقرہ:115

17، القاری، علی بن سلطان، تفسیر ملا علی قاری، ج ا، ص:110

18، البقرہ:125

19، الفتح:۱۰

20، آل عمران:۳۱

21، الرحمٰن:٦٠

22، القاری، علی بن سلطان، تفسیر ملا علی قاری، ج ا، ص:117

23، البقرہ:143

24، القاری، علی بن سلطان، تفسیر ملا علی قاری، ج ا، ص:128

25، القاری، علی بن سلطان، تفسیر ملا علی قاری، ج ا، ص:128

26، البقرہ:148

27، القاری، علی بن سلطان، تفسیر ملا علی قاری، ج ا، ص:133

28، البقرہ:183

29، الترمذی، محمد بن عیسیٰ، سنن ترمذی، کتاب الصیام، باب فضل الصوم، رقم الحدیث:۷۶۴

30، القشیری، مسلم بن حجاج، صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب وجوب صوم رمضان، رقم الحدیث:۲۵۶۷

31، القاری، علی بن سلطان، تفسیر ملا علی قاری، ج ا، ص:158

32، البقرہ:196

33، القاری، علی بن سلطان، تفسیر ملا علی قاری، ج ا، ص:172

34، البقرہ:219

35، القاری، علی بن سلطان، تفسیر ملا علی قاری، ج ا، ص:193

36، آل عمران:31

37، بخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، کتاب الرقاق، باب التواضع، بیروت: دار ابن کثیر، طبع ثانی، 1987ء، رقم الحدیث:، رقم الحدیث:6137

38، القاری، علی بن سلطان، تفسیر ملا علی قاری، ج ا، ص:280

39، النساء:78

40، قاری، علی بن سلطان، تفسیر ملا علی قاری، ج1، ص301

41، الانعام:125

42، القاری، علی بن سلطان، تفسیر ملا علی قاری، ج2، ص:74

43، الاعراف:9

44، سلمی، ص:۲۲۱

45، قاری، ملا علی، تفسیر ملا علی قاری، ج ۲، ص:۱۰۷

46، الاعراف:61

47، النجم، ۲

48، قاری، علی بن سلطان، تفسیر ملا علی قاری، ج1، ص402

49، النحل:16

50، القاری، علی بن سلطان، تفسیر ملا علی قاری، ج3، ص:68